



پچھلی قسط کا خلاصہ

پانچ قالب

وہ پانچ قالب..... پانچ دل..... طاق کا ہندسہ جو جفت کی تاک میں ہے۔  
 حکمتیں جمال کا خواب تھا کہ کوئی پگڑی سوار شہزادہ گھوڑے کو اڑھ لگا کر آنے والا ہے۔  
 سیرت امتیاز سوچتی تھی کہ شیریں فرہاد جیسی محبت پنپ جائے گی۔ کینر فاطمہ کا دل اصل سے بھاگتا تھا۔  
 عدنان جبار کے قالب کی دسترس میں سب آ جاتا تھا۔ لیکن وہ اس میں ہلکان ہوتی تھی کہ سب ہاتھوں سے  
 پھسل رہا ہے۔ فردوس کے دل کا الیہ شناخت تھا کہ وہ بلھے شاہ کے مصرعے کی تصویر تھی۔ بلھا کی جاناں میں کون





چھٹیاں ہو گئی تھیں سب لڑکیاں اپنے گھروں کو جا رہی تھیں۔  
 فردوس کو ہر گاڑی میں بیٹھی تھی کہ بھڑکیلے لباس میں ملبوس عورت نے گاڑی کے شیشے پر اپنی انگلی سے ٹھک  
 ٹھک کی۔ اس کو فردوس کو ہر اپنے قبیلے کی لگی تھی۔  
 فردوس کو ہر گھبرا کر گاڑی سے اتر کر بھاگتی ہے۔ وہ پانچ خولچہ سراسر اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ فردوس اوندھے  
 منہ پورے قدم سے روڈ پر گری تھی۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے اپنے آپ کو رگھی کی گود میں پایا تھا۔

## دسواں باب

”پری چہرے“  
 میں دیکھاں میرا پار نہ دیکھے  
 میں نہ دیکھاں تے ادو دیکھے  
 ایڈے بخت میں کتھوں لیا نواں  
 کہ میرے دیکھن دے وچ دیکھے  
 مابھی تیرے اندر وسدا

تینوں ایوین ہیں بھلکھے  
 یار فریدا ابو ہے یار دے مرے  
 بھانویں دیکھے یا نہ دیکھے  
 پری چہرے ہوتے ہیں۔ دھوکے باز ہوتے  
 ہیں۔ فریبی اور ادا کار سب ہوتے ہیں مگر کچھ اس فن  
 میں ماہر ہو جاتے ہیں۔ اور فن کی دنیا کا کمال تو انسان





کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے بھلا، زمین سے اٹھا کر آسمان تک لے جاتا ہے مگر..... یہ دھوکہ بازی کا فن، فریب کا فن اسی شدت سے زمین کے حوالے کرتا ہے اور جب مٹی میں ملنا ہی حاصل ہو تو پھر کہاں کے عروج اور کہاں کے زوال بس.....!

پری چہرہ تو دنیا ہے۔ فریب میں ڈال کر مسکراتی ہے۔ اور دنیا کو مہارت حاصل ہے۔ دنیا کو تو کوئی زمین کے حوالے بھی نہیں کرتا۔ حج..... بس ہم زمین کے ہیں۔ ہم ہی مٹی کے ہیں..... مٹی ہو جائیں گے تو پھر اس پری چہرہ دنیا کا کیا ہوگا؟

☆☆☆

”تم لوگ مجھے کہاں لے آئے ہو۔“

فردوس گوہر کی جھٹ سے آنکھیں کھلی تھیں اور اسے پہلا احساس ہی اس اجنبی چھت کا ہوا تھا جس کے تلے وہ لیٹی ہوئی تھی۔ جیسے اسے اپنے پیروں میں ابھی بھی وہ ہلکی ہلکی جھن محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی آنکھیں سامنے نکالی تھیں جہاں ریشمی کے ساتھ تین چار اس طرح کی شخصیات براجمان تھیں۔

”پلیز۔ مجھے یہاں سے لے چلو، مجھے گھر جانا ہے۔“

ریشمی اور اس کے ساتھی اسے ٹکلی باندھے دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا رشک اور انینائیت تھی جو پہلی نظر میں ہی فردوس گوہر کو محسوس ہو گئی تھی۔

ریشمی اٹھ کر چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی تھی۔ پیروں والی سائیڈ پہ بیٹھ کر ہولے ہولے اس کے پیر دبانا شروع کر دیے تھے۔

”تم پریشان مت ہو اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔“

آنکھیں کھلتے ہی اس نے اپنے آپ کو ڈبل پینڈ پر موجود پایا تھا جس پہ خوش نما برنڈ پھولوں والی چادر ڈالی ہوئی تھی۔ اور وہ کریم کلر کے پینٹ سے سجا ہوا ایک خوب صورت سا کمر تھا۔ جس کے دونوں طرف اتنا قیمتی ساز و سامان تو نہ تھا، کچھ پینٹنگ

آویزاں تھیں، تین چار لیمپ پڑے تھے اور ہلکی سی مکمل روشنی تھی۔ شاید اس کمرے کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں۔ کیونکہ باہر سے وقفے وقفے سے ٹریفک کے شور، گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ ایک اور چیز جو اسے نظر آرہی تھی وہ سامنے ہی کمرے کے باہر کھلے ہوئے دروازے سے برآمدے کے اوپر روشن دان میں سے آنے والی مسلسل غمر غموں کی آوازیں تھیں شاید وہاں پہ کبوتر رہتے تھے۔

فردوس گوہر نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

”ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم لیٹی رہو اور ہم سے ڈرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔“

اتنا نرم اور ملائمت والا لہجہ فردوس گوہر کو عجیب الجھن میں ڈال گیا تھا۔ ریشمی نے ساتھ کھڑی ان لڑکیوں کو خشکیں نظروں سے گھورا تھا۔

”بالٹیو! یہ کیا میرا منہ تنکے جا رہی ہو۔ جلدی سے کھانے پینے کا انتظام کرو، دیکھ نہیں رہیں یہ بھوکی ہے۔“

بالٹیاں اسے پیار سے دیکھتے ہوئے باہر شاید کچن کی طرف دوڑی تھیں اور تھوڑی دیر بعد ہی کچن سے کھٹ پٹ اور برتنوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں، پوپ لگتا تھا کچن قریب ہی تھا۔

ریشمی کے ساتھ وہ اس گھر کے واش روم کے دروازے تک آئی تھی اور اسے پتا چلا تھا تین کمروں پر مشتمل ایک بڑے سے برآمدے والا کوئی اچھا سا گھر تھا جہاں پہ ایک طرف چھوٹی چھوٹی لگے رکھے ہوئے تھے اور وہاں صفائی بہت خوب تھی۔

ایک چھوٹی سی بچی شاید وہ بھی ان کے قبیلے میں سے ہی تھی یہ اسے سمجھ میں نہیں آیا، وہ پوچھا لگانے میں مصروف تھی۔ اور تب ہی اس نے ایک چارپائی کے ساتھ ایک لڑکی کو آنکھیں بند کر کے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا تھا جس کی گود میں ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ وہ بچی شاید اسی لڑکی کی بیٹی ہوگی جو اپنی ماں کو پٹر پٹر تنکے جاتی تھی۔ مگر وہ لڑکی بھی..... شاید لڑکی نہیں



.....! شاید وہ ان ہی کے قبیلے میں سے تھی تو پھر وہ چھوٹی بچی؟

اس لڑکی کی آنکھوں کے گرد حلقے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ صدیوں سے بھرپور نیند نہ لے سکی تھی۔ ریشمی نے اپنی باٹ دار کیراری آواز میں شاید اسی کو مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔

”ارے چڑیا کب تک مرنی، سڑتی اور جلتی رہے گی، اب آرام کر۔ بچی اب ٹھیک ہے، اسے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تو نے تو اس کی صحت کا بار اپنے سر لے لیا ہے۔ چپ کر کے اسے دودھ پلا، دوائی دے اور سلا دے۔“

چڑیا نامی لڑکی کی حالت پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کسی گہرے مراقبے میں ہو کہ ذرا سی حالت بدلے گی تو سحر ٹوٹ جائے گا۔ مگر پھر بھی وہ بچی کے سر کو کبھی کبھار چھکی دے لیتی تھی۔ لیکن چڑیا کی اپنی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ فردوس نے خود کو واش روم میں بند کر لیا تھا۔ صاف ستھرا واش

روم تھا اور وہاں کے آئینے میں اس نے اپنے چہرے پر لگے نشانوں کو دیکھا تھا۔ اس کے لمبے بال بکھر کر رہ گئے تھے، اب اس نے اپنے سر اے پر نظریں گاڑی تھیں اور پہلی بار اسے لگا تھا کہ وہ بھی ان جیسی ہی تھی..... ویسی ہی.....! شناخت کا جو معما تھا وہ حل ہو گیا تھا جیسے۔ جس سے وہ اتنے سالوں تک بھاگتی

چھپتی رہی تھی آج اچانک سچ سامنے آ گیا تھا۔ شاید اس سچ نے اسے ہلکا کرنا شروع کر دیا تھا دھیرے دھیرے سے، مدوجزر کی کیفیت ٹھہرنے لگی تھی۔ اسے ایک ساتھ جیسے پھر سے کوئی اذیت یاد آئی جب وہ سڑک پر بھاگ رہی تھی اور وہ تالیاں پیٹتے ہوئے

اس کے پیچھے تھے۔ مگر ایک چیز وہ ابھی دیکھ رہی تھی کہ ایک ہل کے لیے اسے یوں محسوس ہو گیا تھا کہ جیسے وہ بھی عام انسانوں جیسے عام انسان تھے اور ان سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اس نے اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تھے اور ایک دم سے جلتی ہوئی آنکھوں کو سکون آیا

تھا۔ جیسے ہی وہ واش روم سے باہر نکلی تھی تو براہِ عملے میں ایک لمبی سی چارپائی پڑی تھی وہاں یہ ایسے ریشمی نے بٹھا دیا تھا اور خود بھی کنارے پر بیٹھ گئی تھی۔ اب بھی وہ آوازیں لگا رہی تھی۔

”کاکیو! ارے۔ کوئی جوس لاؤ، کب سے کہہ رہی ہوں مگر یہ سنتی ہی نہیں ہیں۔“ تھوری دیر بعد وہ جنہیں کاکیاں کہہ کر بلایا گیا تھا نازک گلاس میں تازہ سیب کا جوس نکال کر فردوس گوہر کے سامنے لے آئی تھیں۔

فردوس کا جوس پینے کا بالکل بھی ارادہ نہیں تھا۔ مگر ریشمی نے گلاس اسے پکڑا دیا تھا۔ ”حلال کا ہے۔ بے فکر رہو۔ ہم تمہیں حرام نہیں کھلائیں گے۔“

ریشمی کی اس بات پر فردوس نے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

”اپنے گھر جانا ہے، جانتی ہوں۔ تو خوش قسمت ہے کہ تمہارا گھر بھی ہے، ماں باپ بھی ہیں، رشتے بھی ہیں۔ میں تو یہ دیکھ دیکھ کر، تجھے خیر ان ہو کر سوچتی رہی کہ ایسے کون سے نصیبوں والے ماں باپ ہیں یا تیرے نصیب اوپر والے نے اتنے اچھے لکھے ہیں کہ جنہوں نے تجھے پالا پوسا۔ تو پڑھی لکھی بھی لگتی ہے، مجھے تو تجھ پر رشک آ رہا ہے۔ اور اچھی بات ہے تیرا اپنا آسرا تو ہے۔ بس یہی ہوتا ہے نا، ماں باپ ہی انسان کے کام آتے ہیں ورنہ دنیا تو بس.....“

ایک ہل کے لیے دنیا کا نام لیتے ہوئے جیسے ریشمی کی آنکھوں میں آنسو ڈوبتے ہوئے آنے لگے تھے۔

”ہمیں دیکھو۔ ان چاروں کو دیکھو.....“ وہ چاروں بچن سے نکل کر باہر آ چکی تھیں۔ ”ان کی ذمہ داری بھی مجھ پہ ہے۔ سارا دن لوگوں کے گھروں میں دعوتیں ڈھونڈتے، جھانکتے مانگتے ہوئے گزرتی ہے، فٹ پاتھوں پر گھسنتے رہتے ہیں۔ لوگ گالم گلوچ دیتے رہتے ہیں۔ دنیا عذاب بن چکی ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ گھر کا کھانا ہو، گھر کا پتی ہو، سر کا آسرا



ہے۔ اور ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ زندگی اتنی آسان نہیں ہے پھر بھی مجھے خوشی ہوئی کہ تیرے ماں باپ تیرا خیال تو رکھتے ہیں۔ اور تو اتنی سوتنی ہے کہ تجھے دیکھ کر رشک آتا ہے، دل کرتا ہے اتنی دعائیں دوں کہ جھولی کم پڑ جائے۔“

بھڑکیلے ملبوسات پہنے، ڈھیروں ڈھیروں میک اپ کی تہوں میں چھپے ہوئے خدوخال کسی سستے پرقیوم کی سرورد میں مبتلا کرتی ہوئی خوشبو پہاں تک کہ شاید پورے گھر میں اگر بتیاں روشن تھیں۔ وہ ماحول آہستہ آہستہ گوبر کو نرم کرتا گیا اور وہ اپنے دل میں اچانک اتر جانے والی اس نرمابھٹ سے بالکل لاعلم ہی رہی تھی۔ وہ جو اس کے دل کے اندر تھوڑی سی کدورت اور خوف باقی تھا، وہ ایک دم بالکل ہی زائل ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو پرسکون ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔

مکمل چڑیا کی گود میں لیٹی ہوئی بچی بھی کبوتروں کی آوازوں کی طرف متوجہ تھی۔ فردوس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ چڑیا کی گود میں لیٹی ہوئی بچی سے اپنی نظریں ہٹالے مگر اس کی نظریں اس سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

ریشمی فردوس گوبر کی نظروں کا مرکز بھانپ چکی تھی اس لیے ہنستے ہوئے فردوس گوبر کو مخاطب کیا تھا۔

”دیکھ لے، یہ بھی انسانوں کی اولاد ہے، مکمل ہے لیکن کوڑے سے ڈال گئے۔ محلے والوں میں سے کوئی بھی اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ مگر مرن جوگی چڑیا وہاں سے گزر پڑی اور جیسے ہی بچی پہ نظر پڑی تو ڈٹ گئی کہ پال کے رہے گی۔ پہلے کم ہمارے سر پر لوگوں کے گناہ ثواب کی تلواریں لٹک رہی تھیں اوپر سے چڑیا نے یہ کر دیا۔ خیر، ہم نے بھی یہی سوچا کہ جتنا ہم کھا رہے ہیں یہ بھی سی جان بھی کھالے گی۔ مکان والے نے سارا سامان ہمارا گھر سے بے گھر کر دیا۔ یہ ایک ہفتہ پہلے ہی اس نئے محلے میں، اس گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔ بچی کئی دنوں سے بخار میں پھنک رہی تھی اس

کے لیے چڑیا نے اپنی جان جو کھم میں ڈالی ہوئی ہے۔ دیکھو، کیسے یہ حلقے پڑ گئے آنکھوں کے گرد۔ بچی کو لیے بیٹھی ہوئی ہے بس یہی زندگی ہے، جہاں بہت کچھ ختم ہوتا ہے وہاں بہت کچھ شروع بھی ہو جاتا ہے۔“ ریشمی نے اب کے ایک ٹھنڈا ہنکارا بھرا تھا۔

”تم سناؤ۔ کون ہو۔ کیا کرتی ہو؟ نام کیا ہے تمہارا؟“

اس کے نام پہ شوق سے چاروں نے اسے دیکھا تھا۔

”میرا نام فردوس گوہر ہے۔“ اس نے اپنی خوب صورت آواز میں بتایا تھا اور وہ جیسے باغ باغ ہو گئی تھیں۔ بچی اتنا خوب صورت نام بھی نہیں سنائی تھی۔ وہ چاروں اس کے آس پاس بیٹھ گئی تھیں۔ اور انہوں نے اپنی ذمہ داری لے لی تھی کہ جیسے ہی فردوس گوہر کے ہاتھ میں پکڑا جوں کا گلاس خالی ہوگا اسے دوبارہ بھر دیں گی۔ فردوس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

”بہت شکریہ، آپ لوگوں کا۔“

”شکریہ نہیں کہتے۔ تو ہماری اپنی برادری کی ہے، اللہ تجھے ہمیشہ خوش حال رکھے۔“

روشن دانوں میں کبوتر غوغا کرتے رہے چڑیا بار بار اڑھتی رہی اور بچی کو چھلکتی رہی جواب ایک نیا مشغلہ ڈھونڈ چکی تھی اور بار بار گردن گھما کر فردوس کی طرف دیکھتی تھی۔ جانے کیوں اس کے پھولے پھولے گال دیکھ کر فردوس کا دل چاہا چوری سے اس کے گال تھپتھا کر دیکھے۔ مگر یہ خواہش دل کے اندر ہی کہیں رہ گئی تھی۔

تب ہی بادل گرے اور ساون کی بارش برس پڑی۔ ریشمی نے تڑتڑ برستی بارش کو دیکھا اور فردوس کو مخاطب کیا تھا۔

”ابھی بارش تھمے گی تو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گی۔“

فردوس بھی صورت حال کے پیش نظر خاموش رہی تھی۔ جیسے ہی اندر کہیں کمرے میں ریشمی کم ہوئی



تھی۔ وہ ساری کاکیاں بالڑیاں فردوس کے گرد جھرمٹ ڈال کر بیٹھ گئی تھیں۔ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہونے لگیں، بے معنی سی..... جن کے معنی نہیں ہوتے..... کوئی سرے بھی نہیں ہوتے مگر وہ کرنا ضروری ہوتی ہیں کہ.....!

”بھائی نے چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دیا، تین دن میں دروازے کے باہر بیٹھی رہی۔ چوتھے دن اتنا مارا کہ وہ چوکھٹ چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔“ وہ کمزوری جان اب بھی ماضی کے کسی المناک نا سٹرجیا میں غائب ہو گئی تھی۔ ”پہلے انگلی توڑی، پھر بھنویں کاٹ دیں، کہ میں خاندان کے لیے دھبا ہوں۔ محلے کے سارے لڑکوں نے کوئلے سے منہ پر کالک مل کر نہر میں دھکا دے دیا، مشکل سے جان بچائی اور آج یہاں ہوں۔“

فردوس گوہر سکتے میں تھی..... صدیوں کے بادل تھے، مدتوں کا رونا تھا۔ اس کا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ کیڑوں کی غمغموں، بجلیوں کی گرج میں بند ہو گئی تھی کہیں.....! تب ہی ان بالڑیوں میں سے سب سے چھوٹی بالڑی نے فردوس گوہر کے کان میں سرگوشی کر کے پوچھا تھا۔

”میں آپ کے لمبے بالوں کی چوٹی کر دوں؟“ فردوس گوہر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے آنسوؤں پر قابو بھی نہ پاسکی تھی۔

☆☆☆

سرسراتی ہوئی رات میں وہ دونوں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔

”سکندر کی طرف سے تمہاری تعلیم مکمل ہوتے ہی شادی کی بات کی جا رہی ہے۔“ بختاورد نے اندھیرے میں اپنی بات کے جواب میں کنیراں کے چہرے کے تاثرات کھوجنے کی کوشش کی تھی۔

”کیا اتنا آسان ہوتا ہے کسی دوسرے انسان کی زندگی کا فیصلہ کرنا؟“ اس کے زہر خند لہجے نے بختاورد کو کچھ دیر کے لیے خاموش سا کر دیا تھا۔

”بھئی نہ بھی شادی تو کرنی ہی ہے اور تم نے

اس کے بعد بھی کوئی پڑھائی کرنی ہے کیا؟“ جانے کنیراں نے کون سی خوشبو لگائی ہوئی تھی جو سارے میں ہوئے سے پھیل گئی تھی۔ بختاورد نے ایک گہری سانس لی تھی۔ وہ بے چاری تو پچھلے ایک سال سے وہ خوشبو کی بوتل استعمال کر رہی تھی جو اب کے ایک دوست سعودیہ سے لائے تھے جس کی خوشبو سے اماں کے سر میں درد ہو جاتا تھا۔

”ارے، بختاورد! پرے ہو، یہ کیا مردوں والی خوشبو لگا کر آ گئی ہو۔“

”اماں! اتنی اچھی تو ہے۔“ وہ روہانسی ہو جاتی تھی کہ اسے خوشبو بہت پسند تھی، جو بھی ہو..... جیسی بھی ہو بس خوشبو ہو کہ مہکار پھیل جائے۔

”ارے۔ قسم سے اس خوشبو سے تو سر درد ہو جاتا ہے۔ اس سے اچھا ہے چیللی کے پھول کانوں کے پیچھے اڑس لے۔“

تب کنیراں ماں اور بہن کی بحث کو سنتے ہوئی ہنستی رہتی تھی۔

اماں سوچکی تھیں اور اب بھی ان سے ذرا دور مویشیوں کے پاس چارپائی ڈال کر سوئے ہوئے تھے۔ جبکہ وہ دونوں ابھی بھی گفتگو میں مگن تھیں کہ ان کی آنکھوں میں دور دور تک نیند نہیں تھی۔

”اب تو اس نے اپنا گھراٹا اچھا بنالیا ہے کنیراں، بالکل شہری گھر ہے۔ ہر کوئی جا کر دیکھ آیا ہے، تو بھی کل جا کر دیکھ لینا۔ ویسے بھی کل ہم سب نے ان کے گھر دعوت پر جانا تو ہے ہی۔“

بختاورد نے جیسے اسے گھر کی تعمیر کا لالچ دیا تھا۔ مگر وہ اس کی بات پر ہاں ہوں کرتے ہوئی آسمان پر تاروں کا جال دیکھ رہی تھی۔

”لاہور کا آسمان دھندلا ہوتا ہے، وہاں کبھی ایسے تارے نظر آتے ہی نہیں۔“

”تو تم یہاں سے آنکھوں میں بھر کر لے جاؤ ناں۔“

”میری آنکھوں میں تو ریت کے ٹیلے ہیں۔“ زبان کجنت پھسل گئی تھی، پھر سے سارا جہاں آدم



ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی، سانس میں اچانک  
پہلچ پیدا ہو گئی تھی۔

”بختاور پانی دینا۔“

بختاور گھروچی سے پانی بھرنے گئی تھی۔  
کنیراں کو وہ پھر سے یاد آ گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی  
کہ اب اگر وہ ملا تو وہ خوب بے عزتی کرے گی اس  
کی کہ راستوں میں بے شک آ جایا کرے مگر خیالوں  
پر تو قبضے نہ کرے۔

”یہ لو پانی۔ وہاں کے اور یہاں کے پانی میں  
بھی زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ میں تو اتنا حیران ہوئی  
جب تم نے بتایا کہ وہاں پینے کا پانی بھی خریدنا پڑتا  
ہے، یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی!“ وہ اب بھی شیشے  
کے گلاس میں پانی بھر لائی تھی۔

”بختاور! کیا ضرورت تھی تم ہر بار مجھے شیشے  
کے گلاس میں پانی پکڑاؤ پتی ہو۔ میں وہی کنیراں  
ہوں پہلے والی، بدل تھوڑی گئی ہوں۔“

چاند اچانک ساری باڑیں توڑ کر آسمان کے  
وسط میں آیا تھا۔ بختاور نے سامنے بیٹھی تھل داسی کو  
دیکھا تھا جو ابھی بھی اس بات پر مصر تھی کہ کچھ بھی نہیں  
بدلا..... سب کچھ پہلے جیسا ہے۔ لان کے بڑے  
بڑے پھولوں والے دوپٹے کو کندھے پر ڈالے، کچر  
سے سپدھے بالوں کو جکڑے ہوئے اور سفید ہاتھوں  
کے ناخن کے ساتھ وہ کہاں پرانی کنیراں رہی تھی۔  
پھر اوپر سے اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی وہ دھیمی  
دھیمی سی خوشبو بختاور کو بار بار متوجہ کرتی تھی۔

”ابا نے کہا تھا.....“ وہ پانی کا کھونٹ لیتے  
ہوئی ایک بل کور کی تھی۔

”ابا نے کیا کہا تھا؟“

”یہی کہ تمہارا پہلے سے زیادہ خیال رکھوں،  
اب تم پردیسی ہو۔“

لفظ پردیسی کتنا پرایا ہوتا ہے ایک بل کو دل بیٹھ  
جاتا ہے۔ سفر خیال میں دوڑنے لگتا ہے کہ دوڑتے  
بھاگتے رہیں گے اور منزل کوئی بھی سامنے نہیں  
ہوگی۔

”ابا بھی نابلس.....“ وہ ہولے سے مسکرا کر پھر  
سے لیٹ گئی تھی۔ آنکھیں نیند سے بھاری ہونے لگی  
تھیں۔ بختاور نے تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھ دیا  
تھا۔ کنیراں نے نیند میں کم ہونے سے پہلے بختاور کا  
وہ سوال سنا تھا۔

”تمہارے سینٹ کی خوشبو بہت پیاری ہے،  
یہ تم نے کہاں سے لیا تھا؟“

☆☆☆

کھانے کی میز پر مسلسل برتنوں کا شور تھا وہ بھی  
مکمل اطمینان کے ساتھ اپنے سامنے رکھی پلیٹ خالی  
کرنے کے بعد اب جائے کا کپ لے کر لاؤنج میں  
آ گئی تھی۔ لاؤنج کی لمبی کھڑکی سے باہر لان کا منظر  
صاف نظر آ رہا تھا۔

”تمہاری واپسی کب ہے؟“

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ کبھی سکون سے بیٹھی ہو  
اور آیت اس کا سکون سلامت رسنے دے۔

”تمہیں کیوں میری واپسی کی فکر ہے اتنی؟“  
جائے کا سب لیتے ہوئے اس نے آیت کو ہنسی  
نظروں سے گھورا تھا۔

”ویسے پوچھ رہی ہوں۔“ وہ کندھے اچکا گئی  
تھی۔

”اچھا یہ بتاؤ تمہیں طاہر کیسا لگا؟“

سیرت کو پتا تھا کہ اس سوال میں آیت کی جان  
تھی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ پو پلی بوانے بچن  
سے نکل کر باہر خصوصی طو پر جھانکا تھا۔ اس گھر کے  
مکینوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا ہنستے ہنستے رو بھی پڑتے  
تھے..... شاید اسی خدشے کے تحت باہر دیکھنے کو آئی  
تھیں۔

”تم کیوں مجھ سے پوچھ رہی ہو تمہارے لیے  
میری رائے کون سا اہمیت رکھتی ہے۔“

”تم اگر اپنے اندر کا زہر ختم کر دو تو ہم دونوں  
میں سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔“ آیت نے جیسے اسے  
سنایا تھا۔

وہ شیشے کے باہر پیڑوں پر منڈلائے ہنوروں کو



دیکھ رہی تھی، اس کی بات پر زحی نظروں سے مڑ کر دیکھنے لگی تھی۔

”زہر میرے اندر ہے؟“

وہ سوال وہیں رہ گیا تھا جب پوپلی بوا جوس کا گلاس لیے آگئی تھیں۔

”تم سے کہا بھی تھا کہ صبح صبح جوس پینا مگر تم چائے لے کر بیٹھ گئیں۔“ وہ خفا خفا سی نظر آنے لگیں۔

”بس بوا! یہ تمکین اور کنیراں نے مجھے چائے کی عادت ڈال دی ہے۔ اوپر سے روز مفت میں گوئی اگلا بنا کر پلار ہا ہوتا انکار نہیں بنانا۔“

”اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ چلو اب چائے پی لو پھر کچھ دیر تک جوس لازمی پی لینا۔“ وہ واپس مڑ گئی تھیں تو ابھی بھی آیت منتظر نظروں سے اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”کون سا سوال؟“ سیرت صاف مکر گئی تھی۔ چائے کے کپ کے کنارے اب ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔

”کمر تمہیں طاہر کیسا لگا؟“ آیت امتیاز نے جانے ضبط کی کتنی حدیں پار کر لی تھیں۔

”بالکل تمہارے جیسا ہے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح ایک جملے میں ساری کہانی ختم کر کے رکھ دیتی تھی۔ ایک ایسا اوپن اینڈ ہوتا تھا جس کا اختتام آیت کی مرضی پر مختصر ہوتا تھا کہ چلو جیسے چاہو سوچ لو.....

☆☆☆

گوریا چیز کی روشنیوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے جانے کیوں خلیل کو عدن سے وہ سوال کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

”وہ تمہاری دوست فردوس تو لاہور سے ہے نا۔“

وہ مکمل طور پر اپنی کافی کے جھاگ کی طرف متوجہ تھی۔ اسے بہت دلچسپ لگتا تھا کافی کے جھاگ کو دیکھنا اور پھر دھیرے دھیرے کم ہو جانا۔

”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ویسے ہی خیال آیا تو پوچھ لیا۔“ وہ جانتا تھا

کہ عدن جبار کی فطرت الگ تھی۔ وہ اپنی چیزوں اور رشتوں کے معاملے میں انتہا کی حد تک پوزیشن تھی۔

”وہ تو لاہور سے ہی ہے باقی تمکین اور سیرت

دوسرے شہروں سے ہیں۔ ویسے میں آج ہی سوچ

رہی تھی کہ تم اور میں فردوس سے مل آتے ہیں۔“

خلیل کو وہ لڑکی یاد آئی تھی جو آنکھوں میں

زمانے بھر کا حزن لے کر پھرا کرتی تھی۔ جسے اس نے

آرٹسٹ کہا تھا تو وہ کتنے زحی انداز میں اسے دیکھ رہی

تھی۔

”مام کیسی ہیں؟“ وہ گفتگو کا رخ ہولے سے

موڑ گیا تھا۔

چیز کے اوپر ٹاپ پہنے اور گول ایئر رنگ میں

نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگتی ہوئی عدن

جبار کو احساس تک نہ ہوا تھا۔

”ٹھیک ہیں۔ اب سنبھل گئی ہیں کہ انہوں نے

اب ڈیڈ کو بالکل کنارے کر دیا ہے۔ اپنے گھر کے

کاموں میں مصروف ہو گئی ہیں۔“ عدن جبار کو اپنی

مام میں واضح تبدیلیاں نظر آتی تھیں۔

”مام! آپ کیوں اتنی بدل گئی ہیں۔“

نیل پینٹ کی شیشیاں سامنے بڑی تھیں جو وہ

چیک کرنے کے ساتھ ساتھ الگ رکھتی جا رہی تھی کہ

اپنا پسندیدہ رنگ ہی ڈھونڈنا مشکل ہو گیا تھا۔

”کب تک بھاگتی کب تک تھکاتی خود کو؟“

سارے نقصان ہی مجھے پہنچ رہے تھے۔ رشتے بھی

کھوئے سے بندھے ہوتے ہیں۔ مگر انہیں

آزادیاں ہوتی ہیں کہ جب چاہا کنارے پر ہو گئے۔

اور مجھے کناروں پر کھڑے ہونے کی عادت نہیں

عدن۔“

وہ اپنے رنگ کی تلاش بھول گئی تھی۔ وہ اپنی

ماں کے چہرے پر اپنا پسندیدہ رنگ پھیلتا ہوا دیکھ

رہی تھی۔

”سوچتی ہوں کہ زندگی سفر ہی تو ہے۔ منزل



گلو ر پار کے شیشوں پر دھوئیں کے بادلوں سے  
نہی پھیل گئی تھی۔ چاکلیٹ پکھلنے کی خوشبو چکرا رہی  
تھی۔ خلیل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔  
”میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے لیے کتنا اہم  
اور ضروری ہوں۔ یہ بھی علم ہے کہ میرے معاملے  
میں تم بہت پوزیشن ہو۔ بس اتنا کہوں گا زندگی میں  
کبھی بھی اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو مجھے صفائی کا موقع  
ضرور دینا۔“

عدن جبار کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔  
کیفے نے جلد اس موقع کے آنے کی بو پالی تھی  
جس سے وہ دونوں ہی انجان تھے۔

☆☆☆

وہ دور ریت کے ٹیلوں سے ہٹ کر نظر آتے  
اس زیر تعمیر گھر کی اونچائی سے عجیب خوف میں مبتلا  
ہوئی تھی۔

وہ گھر دور سے ہی توجہ کھینچتا ہوا نظر آتا تھا۔ مکمل  
شہری طرز تعمیر سے آہستہ آہستہ مکمل کو پہنچتا ہوا گھر،  
جسے پہلی نظر میں دیکھ کر ہی یہی خیال آتا تھا کہ بنانے  
والے نے کس محنت اور محبت سے ان بنیادوں کو سینچا  
ہوگا۔

وہ بے اختیاری میں ہی بختاور کا ہاتھ تھام گئی تھی  
کہ کچے راستوں پر چلنے کا طریقہ بھولنے لگا تھا۔ اس  
کی حالت سے بالکل انجان بختاور اپنی باتوں میں لگی  
ہوئی تھی۔

”مسکندر نے شہر سے سارا نقشہ بنوایا ہے اور  
بنانے والے مستری بھی شہر سے آئے تھے۔ وہ خود  
بے چارہ اتنی گرمی میں سارا سارا دن اور رات کو بھی  
خود کام میں لگا رہا۔ کہہ رہا تھا کہ کنیراں کے شایان  
شان گھر بنائے گا جیسے شہروں میں ہوتے ہیں، بالکل  
ویسا ہی۔ ابھی تو چمکتی ہوئی چپس بھی لگے گی اور بہت  
سارا کام باقی ہے۔“

کاش کوئی بختاور کو خبر کرے کہ وہ اپنی باتوں کی  
سختی سے کنیراں کو مٹی میں دفن کرتی جا رہی ہے۔ وہ  
اوپر عمارت جو اپنی شکل و صورت کچھ دنوں تک نکال

سب کی ایک ہے جہاں سب نے چلے جانا ہے۔ بس  
دنیا تو مدت کی جگہ ہے کہ تمام ہوئی اور چل دیے۔  
جہاں ماں باپ جیسے رشتے بھی اپنے اعمال کے  
ساتھ الگ کھڑے ہوں گے وہاں میں نے بھی  
اکیلے ہی کٹھن میں کھڑا ہونا ہے۔ اور رہی بات  
جبار صاحب کی تو دیکھنا منزل پر پہنچ کر بھی میری  
طرف ہی دیکھیں گے تو میں کیوں کم ظرفی کے  
پیمانے لے کر بیٹھی رہوں۔ دکھ تو فقط اس بات کا ہے  
کہ میں نے ایک رشتے کی خاطر خود کو دنیا کے رنگ  
میں رنگنا چاہا کہ رشتہ بجالوں، مگر دیکھ لو عدن۔ کیا کچھ  
کتنا کچھ بانی بچا ہے؟

وہ ملکوں کی حویلی میں بھاگنے دوڑنے والی  
عورت شہر میں آ کر کتنے دار سہتی رہی تھی۔

عدن کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ بھی تو ہر چیز کو اپنی  
دسترس میں رکھنے کی عادی تھی اور اب زرد روستی کے  
بلب کے نیچے بیٹھا ہوا شخص جو اس کے لیے سارے  
رشتوں سے کہیں زیادہ قیمتی تھا۔

وہ اپنی آنکھیں خلیل پر لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ مسلسل  
نظروں کی حرارت سے وہ بے چارہ پزل ہو گیا تھا۔  
”کیا ہو گیا ہے تمہیں عدن؟“

”تم سے محبت۔“ نظروں کی حدت بڑھتی جا  
رہی تھی۔

”وہ تو مجھے پتا ہے۔“ وہ دلکش انداز میں مسکرایا  
تھا۔

”میں تمہاری تصویریں زوم کر کر کے دیکھتی  
رہتی ہوں۔ تمہاری آنکھیں، تمہاری پلکیں بھی،  
تمہارے ہونٹ کا ننھا سا تل بھی جو شاید ابھی تک  
تمہیں بھی نظر نہ آیا ہو۔ محبت ارٹکا زکھا دیتی ہے،  
نظر اتنی ہی نہیں۔“

خلیل کو اپنا آپ مہینوال کے جیسا لگا تھا کیونکہ  
سامنے سوتی بیٹھی تھی۔

”کیا جذبہ ہے کہ ساری کائنات کا سکون ایک  
انسان کے اندر جمع ہوتا ہے کہ وہ سامنے ہے تو سب  
ٹھیک ہے، وہ اوچھل تو سب پرے۔“



دے گی اور گھر ہو جائے گی، جہاں کچھ دنوں تک کنیراں کو بند کر دیا جائے گا اور صحن سے اس کی سائیں بند ہو جائیں گی۔ وہ دروازے پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔

کاشن کے کڑکڑاتے ہوئے سفید سوٹ میں بلبوس اور بیروں میں پشاوری چپل پہنے ہوئے جیسے آنکھیں اور دل رستے پر رکھ دے گا۔  
”بھئی، تم لوگوں نے تو بہت دیر کر دی۔“ وہ جیسے شکوہ کر رہا تھا۔

”اتنی بھی دیر نہیں ہوئی سکندر..... ویسے بھی اس دعوت کا کیا فائدہ جہاں کھانا پکانا بھی ہم نے خود کرنا ہے۔“

بخٹاور نے بے چاروں والی شکل بنالی تھی۔ یہ تو ہمیشہ سے طے تھا کہ چچی کی طبیعت خراب رہتی تھی تو جب بھی کوئی دعوت ہوتی تھی تو تب بخٹاور کی ہی خدمات لی جاتی تھیں اور آج بھی بخٹاور نے ہی سب کچھ کرنا تھا تو وہ ان دونوں کو پیچھے چھوڑ کر دروازہ پار کر گئی تھی۔

”کیسی ہو تم؟“

آنکھوں میں کا جل بھر کر، لمبے گیلے بالوں کو کھلا چھوڑ کر، کاسنی دوپٹا اوڑھے وہ سکندر کو کوئی مغل دور کی شہزادی ہی لگ رہی تھی۔

”ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟“ اسے بخٹاور پر جی بھر کر تاؤ آیا تھا جو اسے وہیں چھوڑ کر اندر بھاگ گئی تھی۔

سکندر نے اشارہ کیا تو وہ اندر کی طرف بڑھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دونوں باتیں بھی کر رہے تھے۔

”کیسا لگ رہا ہوں؟“

سامنے ہی کھانا تھا جہاں پکی اینٹیں لگی ہوئی تھیں اور دیواروں پر انگوڑوں کی بلیں پھیلی ہوئی تھیں وہاں سب کچھ بدل گیا تھا۔ مہندی کے پودوں کی باڑیں لگی ہوئی تھیں ساتھ ہی چپا چھب دکھلا رہے

تھے۔ گیندے کا زرد رنگ دھوپ میں دیکھنے لگا تھا۔ وہ سارے پر نظر ڈالتی ہوئی اس کے سوال پر چونک گئی تھی تو پلٹ کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے کی زحمت کر لی تھی۔

”میری یونیورسٹی میں پڑھتے تو بہت سی شہری لڑکیاں تم پر مرچکی ہوتیں۔“

صحنی مونچھوں تلے اس کے ہونٹ مسکرائے تھے۔

”مجھے شہری تعلق راس نہیں آتے، مجھ پر میرا تھل کافی ہے۔“

وہ ٹھنک گئی تھی۔

”اور اگر تھل کو تم کافی نہ ہوئے تو؟“

وہ بالکل سیدھ میں آ گیا تھا یوں کہ کوئی چارہ نہ رہا۔

”میں تھل سے دستبردار ہو جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

کنیراں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی کہ وہ ایسا تو نہیں تھا کہ کنارے پر ہو جائے۔ اتنی آسانی سے.....!

وہ چچی سے ملی تھی تو انہوں نے بھی محبت سے اسے خود سے لپٹا لیا تھا، چچی جن سے اس کا پھپھو کا رشتہ بھی تھا۔

”کب سے سکندر سے کہہ رہی تھی کہ بچیوں کو لے آؤ۔ کچھ تو گھر میں رونق ہو۔ بس قرآن پڑھنے والے بچے آ جاتے ہیں تو وہی سارے کام کر جاتے ہیں ورنہ مجھ سے کہاں کچھ ہوتا ہے، اوپر سے اس نے گھر کا بکھیڑا کر لیا ہے۔“

وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ جب وہ ٹرے میں گلاس رکھے ہوئے اندر آیا تھا۔ سب سے پہلے اسے کولڈ ڈرنک کا گلاس پیش کیا گیا تھا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

”بد تمیز۔“

وہ چونکا کر مڑا تھا۔

”تم نے مجھے کچھ کہا؟“



بختاور نے ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر چالوں کو دھونا ضروری سمجھا تھا اور مل کی طرف چلی گئی تھی۔

”جان تو تم پہلے ہی لے چکی ہو۔“ وہ جذبول کی شدت سے چور لہجہ کینراں کو ڈھا سا گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ وہ کمزور پڑ گئی تھی۔

”بس کر دو سکندر۔ اللہ کے واسطے بس کر دو، میں اتنی مضبوط نہیں ہوں۔“

وہ ہکا بکا کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔ کاسنی دوپٹا سر سے اتر گیا تھا۔ لمبے بال پشت پر لرز رہے تھے اور سارے وجود پر کچکی سی طاری تھی۔ کینراں قاطعہ کی اس حالت نے سکندر کے اندر کسی خوف کو زندہ کر دیا تھا۔ ابھی تو کچھ مہینے ہی ہوئے تھے اور..... اور.....!

وہ ہولے سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا تھا تو وہ بھی بختاور کی طرح کینراں کے وجود سے اٹھتی ہوئی سینٹ کی خوشبو سے متاثر ہوا تھا۔

”میں واقعی تھل چھوڑ دوں گا کینراں، اتنا حوصلہ ہے مجھ میں۔“

☆☆☆

”کیک کیسا بنا ہے؟“

نیلیم نے اپنی محنت مکمل ہونے کے بعد ان سب کے سامنے اپنا کیک چکھنے کے لیے پیش کیا تھا اور سب سے پہلے اس نے نتاشا کی طرف دیکھا تھا۔

نتاشا کی نظروں میں ایک دم سے ستائش اتر آئی تھی۔

”یار! لگ ہی نہیں رہا کہ یہ تم نے گھر پہ بنایا ہے۔ یوں لگتا ہے میں لاہور کی کسی مشہور بیکری کا کھا رہی ہوں۔ یہ تم نے کیسے بنالیا اتنا پرفیکٹ۔“

نیلیم کے اندر سکون اترنا شروع ہو چکا تھا۔ یہ

انسانی فطرت ہے کہ کوئی بھی تخلیق کی چھوٹی سی بھی قسم

ہو انسان کو وہ ذاتی سکون عطا کرتی ہے جو دنیا کے کسی

بھی کو نے میں میسر نہیں ہوتا ہے۔

”میں تو ہمیشہ سے یہی سمجھتی تھی کہ میرے علاوہ

کوئی اور اچھا کیک بنا ہی نہیں سکتا مگر تم نے تو مجھے بھی

پچھے چھوڑ دیا۔“

”نہیں۔“ وہ صاف مکرتے ہوئے کچن کی طرف آگئی تھی جہاں سلنڈر پر پتیلے چڑھائے بختاور مٹن پکا رہی تھی۔

”قسم سے کچھ پکانے کا سکندر کے گھر میں ہی مڑا آتا ہے۔ گھر میں تو اپلوں کے دھوئیں سے میری آنکھیں نکل جاتی ہیں۔“

وہ سر ہلا کر کچن کی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول کر دیکھنے لگی تھی۔ چند بچے ٹریکٹر ٹراپوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ تین چار عورتیں کھٹل کے سوکھے تنوں کو ڈھور رہی تھیں کہ وہ ایندھن کے کام آتے تھے۔

”تمہاری اور کتنی چھٹیاں رہ گئی ہیں؟“ آج کچم کرتے ہوئے بختاور نے پوچھا تھا۔

”شاید سات یا آٹھ۔“ وہ خود دور ریت کے ٹیلوں کے منظر میں کھوئی ہوئی تھی جہاں سے اونٹوں کی ٹولیاں گزر رہی تھیں۔

”پھر کب آؤ گی؟“

”شاید عید پر ہی۔“

تبھی وہ دروازے میں آن رکھا تھا۔ ”تب تک

انتظار کون کرے عید تو بہت دور ہے ابھی۔“

کینراں نے پیچھے مڑنا بالکل بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

”میں تو سوچ رہا ہوں کہ لاہور کا ایک چکر لگا

ہی لوں۔“ وہ سارے طریقے جانتا تھا کہ کیسے اس کا

سکون غارت کر سکے۔

”تمہارا کیا کام ہے لاہور میں؟“

”تو کیا لاہور صرف تمہارا ہے؟“ وہ بھی آگے

سے سکندر تھا۔

”تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں شہر اس نہیں

آتے۔“

”میرا خیال غلط بھی تو ہو سکتا ہے ناں!“

وہ طیش میں آگئی تھی۔ وہ بھلا کیا سمجھتا تھا خود

کو۔

”میں تمہاری جان لے لوں گی۔“



بھگی ہوئی نظر آئی تھیں اور ان ہی خاتون کے پیچھے وہ لڑکا بھی نظر آیا تھا جو پانی سے شرابور تھا اور اس کے سارے وجود سے پانی ٹپک رہا تھا۔  
 ”یہی شائستہ کا گھر ہے ناں؟“ خاتون نے دروازے کے اندر قدم رکھ کر نتاشا سے استفسار کیا تھا۔ وہ بس سر کو ہی ہلا سکی تھی۔ لڑکے نے بھی جھکتے ہوئے اندر قدم رکھا تھا۔ اماں کمرے سے لپک کر باہر آئی تھیں۔ دونوں خوب گلے لگیں۔

ماہی باجی بھی کھانے کے بعد اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوئی تھیں۔ نیلم کو یوں لگا تھا جیسے اس کی محنت وصول ہو گئی ہے۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ بادلوں کے گرجنے کی آواز نے چونکا دیا تھا۔  
 ”یہ دیکھو، اب ساون کی بارش شروع ہوئی ہے۔“

وہیں بیٹھے بیٹھے بالکل پندرہ منٹ میں ہی بارش برسنی شروع ہوئی تھی اور ہر طرف جل تھل ہو کے رہ گیا تھا اور ماں کو ہول اٹھنے شروع ہو گئے تھے کیونکہ آج ہی ماہی کو دیکھنے رشتے والے آ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صبح سے نیلم بچن میں لگی ہوئی تھی، ماہی باجی بھی تیار ہو کر بیٹھ گئی تھیں اور نتاشا بھی گھر کے ادھر ادھر کے کام نمٹا رہی تھی مگر اب اندرون لاہور کی ساری گلیاں بارش کی وجہ سے جل تھل ہو گئی تھیں۔

نکاسی آب کا صحیح بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے پوری گلیوں میں پانی کھڑا ہو جاتا تھا۔ ہر طرف کچڑ ہو جاتا جس سے بچ بچا کر کھانا بہت مشکل تھا۔ موسم کی شدت کی وجہ سے نیلم پر بھی ایک طرح سے اوس پڑ گئی تھی کیونکہ صبح سے ہی وہ کھانے پکانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ نتاشا بھی صفائیوں میں لگی ہوئی تھی اور ماہی باجی نے اپنے ہاتھوں کی لکیر یوں کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔ شاید زندگی نے ان کے لیے کوئی ایسا حصہ رکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر سے خود کو ناامیدی کے کنویں میں گرنے سے روکنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔

”اماں! یہ ساون کی بارش ہے بھلا اتنی جلدی کہاں رکے گی۔“

اماں بھی کھڑکی کھول کر باہر کا نظارہ کرنے لگی تھیں جہاں چھتیں دور دور تک پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

ابھی وہ انہی باتوں میں مشغول تھے کہ دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہوئی تھی۔ نتاشا نے جیسے ہی دروازہ کھولا تھا تو سامنے خاتون اسے مکمل طور پر

## قاری بہنوں کے لیے خوشخبری

ناول۔ شاعری۔ تاریخی ناول۔ جاسوسی ناول۔

سفر نامے۔ معلوماتی کتابیں۔ عمران سیریز۔

ڈائجسٹوں کے سلسلے۔ بچوں کی اردو کہانیاں۔

بول چال۔ وغیرہ وغیرہ۔

عرض یہ کہ آپ کی مطلوبہ کتاب ہم آپ کو فراہم کر کے دیں گے۔

ہر کتاب کی قیمت پر

**30% فیصد ڈسکاؤنٹ**

خرچہ آپ کے ذمہ

مکھوانے کا پتہ یا دستی خریدنے کے لیے تشریف لائیں۔

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

فون: 02132216361

واٹس اپ نمبر: 03478356396



”ارے! یہ دیکھ لو شائستہ، تم تک پہنچتے پہنچتے یہ حال ہو گیا ہے جیسے لگتا ہے راوی کا منہ ہی ادھر کر دیا گیا ہے۔ پورا لاہور ڈوبنے کو تیار ہے۔ ایک تو ساون کی بارشوں نے اس بار زحمت ہی مچائی ہے بس۔“

اماں نے آگے بڑھ کر موصوف کی پیشانی چومی تھی، وہ لڑکا بھی جیسے شرماسا گیا تھا۔ اماں انہیں اندر کی طرف لائی تھیں۔

”لڑکیو! کوئی تولیہ لاؤ بھائی کے لیے، دیکھو پورا پانی میں بھیگا ہوا ہے۔“

بھائی صاحب ابھی بھی جیسے وہیں خڑے ہوئے کھڑے تھے اور اماں کو لڑکیوں کی سستی پر رہ کر غصہ آرہا تھا۔ نیلم چائے بنانے کے لیے اپنے مرضی کے کام کچن کی طرف بھاگی تھی۔ ماہی کو ابھی تک کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں تب ہی اماں نے انہیں کہا تھا۔

”ارے، کوئی اپنے ابا کے سوکھے کپڑے لاؤ اور بھائی کو پہناؤ۔“

نشا اماں کا سب سے بہترین سوٹ استری کر کے لائی تھی اور جمال کو باتھ روم کا دروازہ دکھایا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آیا تھا تو ڈھیلے ڈھیلے کپڑوں میں اب اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا تھا۔

دونوں ماں نے اپنی داستان امیر حمزہ میں مگن تھیں اور جمال ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ارے بہن مت پوچھو، کیسے ہم وہاں سے گھر سے نکلے۔ ہمیں کیا پتا تھا سیاون کی بارش کا جب اس کا دل چاہتا ہے برس پڑتی ہے، کوئی اس کا وقت معمول تو ہے نہیں۔ صبح سے ہم دونوں بھی ماں بیٹا تیار یوں میں لگے ہوئے تھے کہ راحت آپا نے کہا تھا کہ شائستہ کے گھر ناٹم سے پہنچ جانا۔ بس اس کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دیر سے اکیڈمی سے آتا ہے، بچوں کو پڑھاتا ہے تو اس وجہ سے ذرا معاملات خراب چل رہے تھے، تو ہم نے یہی سوچا کہ چلو تھوڑی دیر گزر گئی

تو چلیں گے۔ اس کے آنے تک میں تیار ہو کے بیٹھی رہی۔ جب تک یہ آیا ہم دونوں نکلے تو اتنی بارش ہوئی کہ اس نے تو یہی کہا کہ ”پھر کسی اچھے موسم میں چلیں گے۔“ میں نے یہ کہا کہ نہیں بیٹا، لڑکی والوں کو بڑا انتظار ہوتا ہے اور وعدہ کر کے مکرانے کے حق میں نہیں ہوں، کل کو نصیب ہوا نہ ہوا رشتہ ہوتا ہے نیت ہے۔ لیکن وعدے سے مکرنا نہیں چاہیے۔“

ماہین ابراہیم نے کپڑی کھول دی تھی، ہلکی بارش کی جھڑپ اندر کودی تھی۔ امید کا بونا جیسے پھر سے ہرا ہونے لگا تھا۔ نیلم گرما گرم چائے اور لوازمات لے کر پہنچ گئی تھی۔

”ارے یہ کون سی والی ہے؟“

”یہ نیلم ہے چھوٹی بیٹی میری اور یہ نشا۔“

”اچھا اچھا کیا کرتی ہیں۔“

”بس یہ ایک جگہ نوکری کرتی ہے اور یہ میک

اپ وغیرہ کا کام کر لیتی ہے۔ اور نیلم ابھی پڑھ رہی

ہے۔“ اماں نے تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

”ارے۔ اس کو بھی تو بلاؤ..... ماہین نظر نہیں

آ رہی۔“

”بس وہ بھی آ رہی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد جب ماہین نے دونوں بہنوں کے ساتھ اندر قدم رکھا تھا تو جمال بے ساختہ طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں اسے آنے والی اس ہستی کے لیے احترام ابھی سے دل میں جاگتا ہوا محسوس ہوا تھا جس سے ابھی رشتے کی بات بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ بارش کے پانی میں بھیکتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔

”بیٹھ جاؤ، تم کیوں کھڑے ہو گئے ہو؟“

ماہی بھی ایک جگہ سکون سے ٹک گئی تھیں اور انہوں نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا تھا جو کہ چائے کی پیالی کا سپ لیتا ہوا بالکل ان کی نظروں کی سیدھے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم سے گڑبڑا گئی تھیں اور انہوں نے نظریں اپنی گود میں رکھی انگلیوں پر جمادی تھیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں چنچنے



ادھر نیلم یہ سوچ رہی تھی کہ ماہین ابراہیم کو وہ مونا جمال کہہ کر پکارے گی یا پھر ماہی جمال۔ کیونکہ وہ نتاشا کے لیے ماہی تھی مگر نیلم کو ان کے نام کو زیادہ ہی باڈرن رکھنے کا شوق تھا اور وہ انہیں مونا کہہ دیا کرتی تھی۔

☆☆☆

زندگی میں پہلی بار آٹو میں سفر کرنے کا اتفاق تھا اور فردوس کو یہ بہت پسند آیا تھا۔ جیسے ساری فضا میں آزاد ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو زمانے کے ہر سرد گرم سے جیسے آزاد پایا تھا۔ ساتھ بیٹھی ہوئی ریشمی نے اس کے چہرے پر عجیب طمانیت سی محسوس کی تھی۔ شاید ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب آپ کے دل کا خوف ایک بار آپ کے سامنے آتا ہے اور پھر کسی لمحے کی طرح گزر جاتا ہے تو آپ کو تب خبر ہوتی ہے کہ یہ تو کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم ایسے ہی وہم کی بستیاں آباد کیے بیٹھے تھے۔ اشاروں پر جہاں بھی آٹو رکتا اور کچھ منچلوں کی نظر ریشمی پر پڑتی تھی تو ان کے ہونٹ سیٹی کی صورت میں سکڑ جاتے تھے۔

”ہیر، کدھر جا رہی ہو؟“ عجیب سوال کرتے تھے وہ۔

”راخجے کول“ ریشمی میں کتنا برداشت کا مادہ تھا کہ وہ چپ چاپ چہرے پر مسکراہٹ سجالتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا، زندگی آسان آسان سی لگ رہی تھی۔ تب ہی کینال کے اشارے پر آٹو رکا تھا اور ریشمی نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا تھا۔ سامنے ہی دو منچلے اپنی ہیوی بائیک پر اشارہ کھینے کے منتظر تھے اور جیسے ہی ان کی نظر ریشمی پر پڑی تھی ان میں سے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے ریشمی کی طرف منہ کر کے تھوک دیا تھا۔ تھوک اس کے منہ پر گر ا تھا۔ فردوس گوہر پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ قیامت کی گھڑی تھی۔

ریشمی نے زخمی نظروں سے گوہر کو دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو، دیکھ لیا ناں زندگی اور لوگ کس طرح منہ

لگی تھیں۔ جمال کی اماں نے چائے کا ایک کپ بنا کر ماہین کو بھی پکڑا دیا تھا جو انہیں ناچاہتے ہوئے بھی تھا منا پڑا تھا۔

جمال نے اسے بھی چائے پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ سو برا اور گریس فل پر سینیٹی کی مالک سامنے بیٹھی شخصیت اسے ایک ہل میں جانے کیوں اچھی لگی تھی۔

”کیا کرتی ہیں آپ؟“ وہ تھوڑا آگے ہو کر پوچھ رہا تھا۔

”پڑھاتی ہوں۔“ وہ مدہم سا لہجہ کسی ریڈیو کی صوتی لہروں کی طرح جمال تک پہنچا تھا۔ ”مجھے پڑھائیں گی، میرا حساب بہت کمزور ہے۔“

بارش تھم چکی تھی مگر شاید اس کی چائے کی پیالی میں شرارتیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ باز نہیں آ رہا تھا، نتاشا نے بمشکل ہنسی روکی تھی۔ جمال نے نتاشا کو جیسے سرزنش کی تھی۔ ”آپ انہیں زروس کر رہی ہیں۔“

”میں نہیں، آپ کر رہے ہیں۔ اور شکل سے تو لگتا ہے آپ کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔“ ”زبان نہ ہوتی تو ہمیں کہاں یہ رشتہ ملتا تھا۔“ نے چارگی بھرے اس لہجے پر ماہی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

تب ہی نیلم نتاشا کا سیل فون پکڑے ان کی طرف آئی تھی۔

”نتاشا! تمہارا فون بج رہا ہے۔“ نتاشا فون لے کر کھڑکیوں کی طرف آگئی تھی دوسری طرف مسز گوہر کا پریشان لہجہ سنائی دیا تھا۔ ”فردوس جانے کہاں ہے، گھر نہیں آئی ابھی تک۔ جانے کب سے نکلی ہوئی ہے، تمہاری طرف تو نہیں ہے؟“

نتاشا کو ان کے سوال نے سن کر دیا تھا۔ فردوس گوہر جانے کہاں تھی اس کا نمبر بھی بند جا رہا تھا۔



پر تھپڑ مارتے ہیں۔ کیسی دشمنی نبھاتے ہیں۔  
فردوس نے ان کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں  
میں لے کر دو ٹپے سے صاف کیا تھا۔ وہ چاپ چاپ  
سکستی رہی..... بگتی رہی.....!

”آئی ایم سوری!“ جیسے یہ تین حرف سب  
زائل کر دیں گے۔ ذلت کہاں اتنی جلدی ختم ہوتی  
ہے.....

”سالوں ہو گئے ہیں فردوس، یہ تھوک صاف  
کرتے کرتے..... اب تو عادت ہو گئی ہے میری  
عادتیں مت بگاڑو۔“  
”زندگی کتنی مشکل ہے ناں ریشم!“ وہ روتے  
روتے ہنس دی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا کہ میرا اصل نام ریشم ہوگا۔“  
”بس مجھے پتا چل گیا۔“ فردوس کو ہرنے اپنی  
پشت پر بالوں کی چوٹی کا وزن محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ  
سرگوشی پھر سے زندہ ہونے لگی تھی۔

”کیا میں آپ کے بالوں کی چوٹی کر دوں؟“  
وہ چوٹی جیسے اس کی زندگی کے سارے بوجھ  
ملنے کر رہی تھی..... وہ واپسی پر چڑیا کی بیٹی کے گال  
ٹپٹہٹھا کر آئی تھی۔ روشن دانوں میں کبوتر اب بھی غٹر  
غوں گھر رہے تھے۔ بالٹریاں اب بھی جوس بنا کر کلنگر  
اسے دیکھتی تھیں۔

”آپ کے نام کا مطلب جنت ہے ناں۔“  
وہ وہیں ٹھہر گئی۔ جیسے کائنات کسی نقطے پر آگئی  
ہو۔

”آپ دوبارہ کب آئیں گی؟“ وہ سوال دنیا  
کا مشکل ترین تھا۔

ریشم نے انہیں ڈپٹ دیا تھا۔  
”اب یہ کبھی نہیں آئیں گی۔ ان سے تعلق ابھی  
سے ختم۔ ان کی اپنی زندگی ہے انہیں گزارنے دو۔“  
فردوس نے مسکراتے کی کوشش کی تھی۔ بالٹیوں کے  
چہروں پر تاریک سائے لہرا گئے تھے۔

ریشم آٹو دیکھنے باہر چلی گئی تھیں۔ تب تک وہ  
چھوٹی لڑکی پھر سے اس کے سامنے آگئی تھی۔ اپنی

تمام تر سرگوشیوں سمیت۔  
”ریشم سے چھپ کر کبھی آپ مجھ سے ملنے  
ضرور آئیے گا، میں انتظار کروں گی۔“  
سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا ریشم اے آگے کی  
طرف لے آئی تھی۔

”ہاتھ تھک گئے ہیں فردوس، تالیاں پیٹتے  
پیٹتے۔“

وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھی، آنسو  
گالوں پر خشک ہو گئے تھے۔ پتا بھی نہیں چلا اور وہ  
منزل مقصود پر پہنچ چکی تھیں۔

فردوس کو ہرنے آٹو سے نکل کر سامنے موجود  
اس عمارت پر نظر ڈالی تھی جہاں کی وہ مالک تھی۔  
جہاں کا اسے آسرا تھا۔ دو چیزوں کا امتزاج، لکڑی  
اور شیشہ.....!

ریشم آٹو میں ہی بیٹھی رہی تھی۔ وہ اس کی  
طرف جھکی تھی۔

”اندر آ جائیں، آپ میرا گھر دیکھ لیں۔“  
ریشم نے تھوڑا سا آگے ہو کر اس کی پیشانی  
چوم لی تھی۔

”ناں فردوس ناں، بس کچھ تعلق جہاں تک  
ہوتے ہیں وہیں تک رکھو ورنہ آزار بن جاتے ہیں۔  
جھولی بھر بھر دعائیں کروں گی کہ اللہ تمہیں زندگی میں  
کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔“

وہ تھکے ہوئے قدموں سے گیٹ کی طرف آئی  
تھی۔ جیسے بہت کچھ پیچھے رہ گیا ہو۔ جن لوگوں سے،  
جس شناخت کے بارے میں وہ زمانے سے سستی ہوئی  
آئی تھی اس کی اصل آج پتا چلی تھی۔ گیٹ کھلنے سے  
پہلے اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ ریشم جا چکی تھی  
اب سڑک پر دھول ہی دھول اڑ رہی تھی۔ شاید وہ اب  
زندگی میں کبھی نہیں ملنے والے تھے۔

جب پری چہروں پہ چھائی ہو فتا  
تب فریب زندگی کا حسن ہوا لا

☆☆